اور اس کا ثبوت اس پر مبنی ہے۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ، ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ کے ارشاد ربانی کے مطابق ہر عمل کی مکافات ضروری ہے، ہر معاملہ میں عدل وانصاف امانت ودیانت، راست گوئی اور راست بازی کی رعایت ناگزیر اور اسی طرح شریعت میں جو حلال وحرام ہے اس کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ پس اسلام میں دین ودنیا اور مذہب وسیاست دونوں ایک ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان جو کام بھی کرے گا اس کو بہرکیف احکام شریعت کا پابند رہنا ضروری ہو گا۔

لیکن انسان مدنی الطبع ہے، اس لیے معاملات کی قسمیں اور ان کی نوعیتیں گوناگوں ہیں۔ یہ معاملات اقتصادی اور معاشرتی بھی ہوتے ہیں اور سیاسی اور کاروباری بھی وغیرہ وغیرہ، پھر یہ معاملات ملکی، قومی اور بین الاقوامی بھی ہوتے ہیں اور مذہبی وملی بھی، اور پھر یہ معاملات انفرادی بھی ہوتے ہیں اور اجتماعی بھی، اور چونکہ سب کام تنہا ایک ادارہ انجام نہیں دے سکتا اس لیے ہر کام کے لیے الگ الگ ایک ادارہ ہوتا ہے اور ہر ادارہ کی ہیئت ترکیبی ان افراد واشخاص پر مشتمل ہوتی ہے جو اس ادارہ کے اغراض ومقاصد اور اس کے طریقۂ کار کے بارے میں متفق اور متحد الخیال ہوں اب ظاہر ہے ایک ادارہ اگر مذہبی کاموں کے لیے قائم ہوتا ہے تو اس ادارہ کے سب کارکن اہل مذہب ہی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے لوگ اس میں شریک نہ ہو سکیں گے، لیکن اگر ایک ادارہ ملک اور قوم کے مشترک مسائل ومعاملات کی انجام دہی کے لیے قائم کیا جاتا ہے تو اس میں مذہب کی قید وبند نہ ہونی چاہیے۔ اس قسم کے ادارے سیاسی بھی ہو سکتے ہیں اور اقتصادی اور سماجی بھی، تعلیمی بھی ہو سکتے ہیں اور تجارتی وصنعتی بھی۔ اس ادارہ کو اگر ایک مذہب کے چند افراد مل کر قائم کر رہے ہیں تب بھی ان لوگوں کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے اپنے ہم خیال لوگوں کا تعاون اور اشتراک حاصل کریں، کیونکہ غیر فرقہ وارانہ مسائل کا کامیاب اور نتیجہ خیز حل ایک مشترک پلیٹ فارم پر ہی ہو سکتا ہے۔

یہاں ایک بات بڑی اہم اور توجہ طلب یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریریں

جس کا حوالہ گذشتہ ماہ کے نظرات میں دیا گیا ہے یہ فرمایا ہے کہ "اگر مسلمان سیاسی کام کرنا چاہیں تو مثلاً انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے ایک مشترکہ اور غیر فرقہ وارانہ جماعت بنائیں"۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ملک میں کانگرس جس کے ایک بلند پایہ رکن خود مولانا بھی تھے، اس کے علاوہ اور بھی متعدد سیاسی سیکولر پارٹیاں سرگرم عمل تھیں تو پھر مولانا نے یہ کیوں نہیں فرمایا: "اگر مسلمان سیاسی کام کرنا چاہیں تو کانگرس یا کسی سیاسی پارٹی میں شریک ہو جائیں" ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طویل اور نہایت فعال و متحرک سیاسی زندگی بسر کرنے کے بعد غالباً مولانا افسوس اور دکھ سے یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ملک میں جو سیاسی پارٹیاں کام کر رہی ہیں، مجموعی اعتبار سے وہ اس صدق و صفا باطنی اور اخلاص فکر و عمل سے تہی مایہ ہیں جو ملک و قوم کی بے لوث و بے غرض خدمات انجام دینے کے لیے شرط اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا کو اس بات کا صدمہ اور رنج تھا کہ اب پارلیمنٹ یا اسمبلی کی ممبری اور وزارت کی کرسی، یہ دونوں چیزیں جلب منفعت اور حصول ذاتی عزت و وجاہت کا ذریعہ و وسیلہ اور آلۂ کار بنتی جا رہی ہیں اور تو اور جب سے انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ کانگرس میں گاندھی اور نہرو کی روح کمزور اور پٹیل کی روح قوی تر ہوتی جا رہی ہے۔ مولانا ... اخیر میں کانگرس سے بھی بددل ہو چلے تھے، چنانچہ ان کی کتاب (India wins freedom) اس کی شاہد عدل ہے۔ اس بنا پر اگر بوڑھے اور ضعیف و کمزور ہو جانے کی وجہ سے گاندھی جی کی طرح اپنے دیرینہ رفقاء سے الگ ہونے کا خیال دامنگیر نہ ہوتا تو اغلب یہ ہے کہ مولانا اپنی ایک نئی سیاسی پارٹی الگ بناتے۔ ظاہر ہے سیاسی جماعتوں کا یہ خود غرضانہ طریق عمل اسلامی اصول حیات جن کا ذکر ابھی ہوا ہے ان کے خلاف ہے، اس وجہ سے مولانا کا غالباً منشا یہ تھا کہ مسلمان خود اقدام کریں اور ایک مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم بنائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمان مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ پر عمل کرتے اور ان کے منشا کے مطابق اپنے ہم خیال و ہم مسلک برادران وطن کے اشتراک و تعاون سے اپنی ایک سیاسی پارٹی الگ بناتے، اس کے لیے عزم و استقلال اور ہمت و جرأت سے کام کرتے اور سیاست کا رشتہ اخلاق، ایمانداری اور دیانت سے منقطع نہ ہونے دیتے تو وہ ملک میں ایسے بے یار و مددگار نظر نہ آتے جیسے کہ اب نظر آ رہے ہیں۔

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں محرکات، مسائل اور مقاصد

(۶)

از: جناب ڈاکٹر محمد لیسین مظہر صدیقی استاد شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جہاں تک سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت کا تعلق ہے تو کسی تفسیری یا تاریخی روایت سے اسکی تائید نہیں ہوتی ہے کہ ماہ مقدس میں قتال وجدال کرنے کے سلسلے میں مسلمانوں نے سوالات کیے تھے۔ صرف واقدی اور بلاذری کا خیال ہے کہ بعض مسلمانوں نے اس سلسلے میں استفسار کیا تھا جبکہ ابن اسحاق نے سوالات کرنے والوں کی صراحت نہیں کی ہے۔ طبری اور ابن کثیر نے اپنی تفاسیر میں متعدد روایات بیان کی ہیں جن سے عیاں ہوتا ہے کہ آیت میں مذکورہ سائلین سے مراد کفار و مشرکین مکہ تھے، نہ کہ مسلمانان مدینہ۔[۱۵۱] پھر بعض مفسرین اور علماء نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ آیت کا سیاق وسباق بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کفار سائلین اور ان کے اعتراضات کا جواب مذکور ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ خدا کی راہ سے روکنے اور مسجد حرام میں نہ داخل ہونے دینے اور کفر الٰہی کرنے اور مسجد حرام کے باسیوں کو جلاوطن کرنے اور قتل سے زیادہ فتنہ کے خطرناک ہونے کا مسلمانوں کو جواب میں طعنہ نہیں دیا جاسکتا تھا۔ دراصل یہ وہ جرائم تھے جن کے مرتکب کفار مکہ ہوتے تھے اور شہر حرام میں قتال پر ان کی طعنہ زنی کے جواب میں ان کے تمام بڑے بڑے جرائم گنائے گئے تھے[۱۵۲] اس کے علاوہ آیت کا آخری فقرہ کہ وہ تم سے

برابر لڑتے رہیں گے اور اپنی استطاعت بھر تم کو تمہارے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے سے آیت کے اولین فقرے کی تصریح ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ الزامی جوابات مکہ کے قریش کے اعتراضات کے ردعمل کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ جہاں تک "شہر حرام" میں قتال کی خطرناکی کا تعلق ہے قرآن مجید اس کا سبب بے حرمتی کو خاصہ اہم معاملہ دکبیر) تصور کرتا ہے اور اس حقیقت سے نہ صرف اس آیت میں انکار کیا گیا ہے بلکہ قرآن مجید کی ماہ حرام سے متعلق دوسری آیات میں بھی اس سے انکار نہیں ہے بلکہ حرمت مقدس ماہ کو اسلام میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ جیسے کہ ابھی ہم دیکھیں گے۔ اسی طرح تاریخی روایات میں بھی مقدس مہینے یا مہینوں کی حرمت وتقدیس کا اعتراف کیا گیا ہے۔ ضمناً اس سے واٹ کے اس خیال کی تردید بھی ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماہ مقدس کی حرمت کا خیال نہ تھا، یا آپ ان کی بے حرمتی کو جائز سمجھتے تھے۔ مقدس مہینوں کے معاملہ میں عرب کے قدیم جاہلی مذہب اور دین اسلام میں بنیادی طور پر کوئی فرق خداوند کریم نے نہیں روا رکھا ہے اگر کوئی فرق ہے بھی تو وہ ان مہینوں میں قتال کی ممانعت کا مشروط ہونا ہے یعنی مسلمان اپنی طرف سے جنگ کا آغاز تو نہیں کرسکتے لیکن اگر اینٹ دوسری طرف سے آئے تو اس کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔[۱۵۴] اسی بنا پر اکثر مسلمان علماء اس آیت کے ناسخ ہونے کے قائل ہیں[۱۵۵] اور اسی سبب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کے زمانے میں متعدد غزوات وسرایا مختلف مقدس مہینوں میں بھیجے یا خود لے کر گئے تھے[۱۵۶]

جدید محققین کی اسلامی سال میں مقدس مہینوں کے بارے میں تحقیق بڑی دلچسپ مگر غیر منطقی ہے۔ واٹ کا خیال ہے کہ "اشہر حرم" (مقدس مہینوں) کی تعیین خاصی مشکل ہے حالانکہ سورہ توبہ کی آیت ۳۶ کی نص قرآنی میں جن مقدس مہینوں کا ذکر ہے ان کی تعیین مسلم علماء محققین نے بصراحت اور حتمی طور سے کردی ہے چنانچہ مفسرین اسلام۔ اسلامی تقویم کے چار ماہ۔ رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ کو مقدس و حرام بتاتے ہیں۔ واٹ کا یہ بھی کہنا ہے کہ قرآن بعض دوسری جگہوں پر صرف ایک ماہ مقدس کا ذکر کرتا ہے اور پھر انھوں نے ایک اور مستشرق کے

اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ غالباً عرب میں مختلف علاقے اور قبیلے مختلف مہینوں کی تقدیس و حرمت کے قائل تھے۔ چنانچہ ان دونوں مستشرقین کے نزدیک چار ماہ مقدس کی قید و شرط دراصل ایک مصالحانہ کوشش ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ واقعہ نخلہ پر مدینہ میں اتنا شدید ردعمل کیوں ہوا تھا اور آپ کو اس ردعمل پر کیوں حیرت سے دوچار ہونا پڑا تھا؟[۱۵۷]

یہ پورا تجزیہ غیر علمی اور غیر مستند ہے اور محض اپنے دعویٰ کی دلیل فراہم کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے۔ ورنہ اس میں تضادات ہیں اور گہرائی سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دعوے کی دلیل نہیں فراہم ہوتی بلکہ اس کی انہی کی دلیل سے تردید ہوتی ہے۔ نص قرآنی میں بصراحت فیصلہ خداوندی ہے کہ "مہینوں کی گنتی اللہ کے پاس بارہ مہینے ہیں اللہ کے حکم میں جس دن پیدا کیے آسمان و زمین۔ ان میں چار ہیں ادب کے۔[۱۵۸]" اگرچہ نص قرآنی میں ان کی تعیین نہیں ملتی لیکن تفسیری روایات، احادیث و آثار اور تاریخی شہادتوں سے ان کی واضح و غیر مبہم تعیین و تصریح ملتی ہے۔ اور تمام روایات و شواہد میں مکمل اتفاق ہے اور ایک روایت بھی ایسی نہیں پائی جاتی جس سے یہ شبہ ہی پیدا ہو سکے کہ مذکورہ بالا چاروں مہینوں کے سوا اور کوئی مہینہ مقدس تھا یا ہو سکتا ہے۔[۱۵۹] واٹ نے قرآن کریم کی ان آیتوں سے جن میں صرف ایک ماہ حرام کا ذکر ہے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ قرآن کے نزدیک بھی متبرک مہینوں کا معاملہ مشتبہ یا کم از کم غیر متعین ہے لیکن یہ استنباط غیر علمی ہے۔ جہاں جہاں قرآن نے ماہ مقدس کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے وہاں انہیں مذکورہ بالا مقدس مہینوں میں سے کوئی ایک مخصوص مہینہ مراد ہے جس کا آیت متعلقہ کے سیاق و سباق سے صاف پتہ چل جاتا ہے۔[۱۶۰] تاریخی شواہد اس پر قطعی طور پر دلالت کرتے ہیں کہ مقدس مہینوں کے بارے میں قرآنی تصریح اور احادیث و آثار اور عربوں کے سماجی دستور و عادت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مستشرقین کا یہ خیال کہ چار ماہ کی قید ایک مصالحانہ کوشش ہے ورنہ مختلف علاقوں میں مختلف مہینے مقدس سمجھے جاتے تھے۔[۱۶۱] نہ تو تاریخی ثبوت اور نہ ہی تنقید کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔ اس خیال کی تردید عربوں کے "قاعدہ نسی"[۱۶۲] سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ اپنی دنیاوی مصلحتوں کی خاطر ماہ حرام کو حلال کر لیتے تھے۔

قرآن مجید کی اگلی آیت ہی میں اس بے حرمتی ماہ مقدس پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مختلف علاقے میں مختلف مہینے مقدس یا حرام ہوتے تو شاید سال کا کوئی حصہ اس سے خالی نہ جاتا۔ لہذا مختلف مقامات پر "نسی" کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اس کے علاوہ اس صورت میں مقدس مہینوں کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ ان مقدس مہینوں میں جان و مال کی حفاظت کی ضمانت ملتی تھی کیونکہ جنگ و جدال کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ جنگ وجدال، لوٹ مار سے بھرپور اور غیر محفوظ و غیر مامون زندگی میں عرب قبائل کو انہیں مقدس مہینوں میں امن وچین کا سانس لینے کا موقعہ ملتا تھا اور بلاخوف و خطر وہ ایک دوسرے علاقے میں سماجی و معاشی ضروریات سے آجا سکتے تھے۔ اگر پلسنر (PLESSNER) اور لیون کیبانی وغیرہ کا خیال قبول کر لیا جائے تو عرب سماج میں جان و مال کے تحفظ کا تصور ہی ختم ہو جائیگا اور سال کا کوئی حصہ بھی محفوظ و مامون نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اس خیال سے ان کے اپنے دعوے کی تردید ہوتی ہے اور وہ یوں کہ اس خیال کے مطابق عین ممکن تھا کہ رجب کا مہینہ مدینہ والوں کے لیے مقدس نہ رہا ہو اور اس کی تقدیس کے قائل صرف مکہ والے رہے ہوں۔(۱۶۳) یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمانان مدینہ نے مجاہدین نخلہ کو ماہ مقدس کی بے حرمتی پر لعن طعن نہیں کیا تھا بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کی وجہ سے کیا تھا۔(۱۶۴) پھر ماہ مقدس کا اعتراض اٹھانے والے مکی تھے، مدنی مسلمان(۱۶۵) نہیں۔ تاہم قرآن تسلیم کرتا ہے کہ اس ماہ مقدس کی تقدیس بدستور قائم تھی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسکو بحال رکھا اور تسلیم کیا تھا۔ بہرحال یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی تقویم میں چار مخصوص ماہ حرام تھے اور انکی تعیین میں کسی قسم کا اشتباہ و اختلاف نہ تھا اور یہ کوئی مصالحانہ کوشش نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔

اب آخر میں اس نکتہ پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ آخر مجاہدین نخلہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے تجاوز کر کے یا ایک طرح سے آپؐ کے حکم مخالفت کر کے ماہ مقدس میں کاروان نخلہ پر حملہ کیا ہی کیوں تھا؟ وہ تو قریش یا کاروانِ قریش کی خبریں فراہم کرنے گئے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ واقدی وغیرہ کے خیال میں یہ حملہ غرض دنیا کی طالبوں کی طلب کی وجہ سے ہوا تھا اور مغربی مورخین

ں حملہ کا مقصد و محرک ہی لوٹ مار قرار دیتے ہیں۔ ماہ مقدس میں حملہ و لوٹ مار کا ارتکاب کرنے کی توجیہ
غدسے یہ ہوتی ہے کہ تاخیر کی صورت میں کارواں ہاتھ سے نکل جاتا۔ واٹ نے ایک مزید توجیہ یہ کی ہے
ہ کاروان نخلہ نے متوقع تاریخوں سے کچھ پہلے آکر سارے اندازے گڑبڑ کر دیئے تھے۔ لیکن ان دونوں
وجیہات کی تردید روایات و تنقید سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کارواں اپنی تقدیم آمد کے سبب توقع کے خلاف
آگیا تھا تو اسے نکل جانے دیتے کیونکہ اس راہ پر تو کارواں گذرتے ہی رہتے ہیں۔ ایک دن کے صبر کے
بعد وہ کسی اور کارواں کو نشانہ بنالیتے۔ یا پھر جس کاروانِ قریش کا حوالہ واقدی وغیرہ کے یہاں موجود ہے
اس سے یہی مخصوص کارواں مراد تھا۔ لیکن اس خیال کی تردید مختلف شہادتوں سے ہوتی ہے۔ واقدی
کی روایت کا وہ حصہ جو مسلم مجاہدین کے حملہ حامی و مخالف طبقوں میں بٹ جانے کا ذکر کرتا ہے(۱۲۶) اسکی
تردید کرتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "عرض دنیا" اور حملہ مخالف طبقہ کیوں حملہ میں شریک
اور حملہ حامی طبقہ سے متفق ہوا تھا۔ روایات میں اس کا کوئی جواب یا توجیہ نہیں ہے۔ لیکن ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ حملہ حامی فریق کے پاس کچھ دلائل اور مصالح تھے جنھوں نے حملہ مخالف فریق کو بھی
ان کے خیال سے متفق ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

دراصل صورت حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ مسلم مجاہدین غالباً سرِشام نخلہ میں پہنچ کر مقیم ہی ہوئے
تھے کہ اچانک غیر متوقع طور پر کاروان نخلہ وہاں پہنچ گیا اور اتفاق سے ان کے قریب ہی میں
خیمہ زن ہوا۔ دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے خوف محسوس ہوا۔ کاروانِ نخلہ والوں کو تو
غارتگری کا خوف تھا جسے حضرت عکاشہ بن محصن اسدی نے فوری طور پر حلق کرا کے اور اس کے
ذریعہ ان کو یہ تاثر دے کر کہ وہ زائرین کی جماعت ہے، غارتگروں کی نہیں، قریشیوں کا خوف تو
فوری طور سے دور کر دیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حضرت عکاشہ کا حلق کرانا مخالف جماعت
کو اطمینان دلانے کے لیے تھا وہاں مسلمانوں کا یہ بھی مطمح نظر تھا کہ قریشی ان کے بارے میں مزید
تفتیش نہ کریں۔ یہ ترکیب غارتگری کے منصوبے کی تکمیل کے لیے نہیں کی گئی تھی جیسا کہ اس کو
عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مسلم جماعت غارت گری کے لیے نہیں بلکہ

خبروں کی فراہمی یا جاسوسی کے لیے آئی تھی۔ ابن اسحاق اور واقدی دونوں کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عکاشہ کا حلق کرانا قریشی کارواں آنے کے فوراً بعد ہوا تھا اور اس پر مجاہدین نے حملہ کرنے کا فیصلہ بعد میں کیا تھا[۱۶۷]۔ روایات کی یہ ترتیب زمانی ہے اور اس کے اسی طرح ماننے کا ایک سبب یہ ہے کہ مسلمان مجاہدین خود بھی قریشیوں کی نظر میں آنے سے کترا رہے تھے اور بچنا چاہتے تھے۔ چنانچہ روایات میں صراحت ہے کہ قریشیوں کے سامنے صرف حضرت عکاشہ آئے تھے۔ مسلمانوں کے قریشیوں کی نگاہ سے بچنے کا سبب ظاہر ہی تھا کہ وہ سب کے سب محلوق نہ تھے اور ان کو اگر قریشی دیکھ لیتے تو سمجھ جاتے کہ وہ جماعت زائرین نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ لیکن اس ظاہری سبب کے علاوہ اس سے کہیں زیادہ ایک اور باطنی سبب تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ مسلم جماعت میں قریش مکہ کے کئی جانے پہچانے چہرے تھے۔ اور کوئی ہو یا نہ ہو لیکن کم از کم دو حضرات ایک تو خود امیر سریہ حضرت عبداللہ بن جحش[۱۶۸] اور دوسرے حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ اموی[۱۶۹] مکہ اور قریش کی جانی بوجھی شخصیتیں تھیں۔ اور کسی بھی مکی کی نظروں سے وہ چھپ نہیں سکتی تھیں۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ مکی کارواں پورے کا پورا بنو مخزوم کے اہم اشخاص پر مشتمل تھا اور ان کے اور بنو امیہ کے درمیان تجارتی، معاشی اور سماجی تعلقات بہت گہرے اور قریبی تھے[۱۷۰] اس لیے ان دونوں مسلموں کی شناخت اور بھی آسان تھی۔ بظاہر حضرت عکاشہ کو محلوق دیکھ کر قریشی مطمئن ہو گئے تھے لیکن مسلمانوں کا اضطراب ختم نہ ہوا تھا۔ ان کا سامنا اس کارواں سے اچانک ہوا تھا اور فوری طور پر وہ اپنی شناخت سے بچ بھی گئے تھے لیکن اس کا احتمال تھا کہ کسی وقت کوئی قریشی تفتیش حال یا کسی ضرورت سے مسلم جماعت کے قریب آنکلے تو وہ بڑی آسانی سے مسلمان مجاہدین کی شناخت کر کے پورے قافلے کو ہوشیار کر سکتا تھا اور نہ صرف ان کو بلکہ قرب وجوار کے قبیلوں کو اور مکہ والوں کو بھی۔ اور مسلمانوں کی شناخت سے نہ صرف یہ کہ قریش کے بارے میں خبروں کی فراہمی کا کام مشکل ہو جاتا بلکہ خود مسلم مجاہدین کی زندگی کے لالے پڑ جاتے۔ اور غالباً یہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم جماعت کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ

جہیں رہ گئی تھا کہ وہ کاروان قریش پر حملہ کرکے ان کے تمام آدمیوں کو مار ڈالے یا گرفتار کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کی وہاں موجودگی کا راز نہ کھلنے پائے۔ اور درحقیقت انھوں نے ایسا اسی لیے کیا بھی تھا اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن ایک شخص کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح مجاہدین کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ مآخذ میں مسلمانوں کے کاروان نخلہ پر حملہ کرنے کے فیصلے کے ضمن میں دو جملے بہت اہم ہیں۔ ان کا فیصلہ تھا کہ ان میں سے جو مل جاتے اسے قتل کر دیا جاتے یا گرفتار کر دیا جاتے اور ان کے سامان پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہ دونوں جملے ثابت کرتے ہیں کہ اصلاً حملہ کرنا یا چھاپہ مارنا مقصود نہ تھا بلکہ یہ ایک وقتی فیصلہ تھا جو حالات کے تحت فوراً کیا گیا تھا اور راز داری یا خود حفاظتی کے اسباب و عوامل کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ کارواں کے ایک شخص کے نکل جانے کی وجہ سے مسلم جماعت کا نخلہ میں قیام بے معنی ہو گیا تھا اس لیے مدینہ واپس ہونا فطری اور حقیقی تھا۔ مآخذ کے اس اصرار کی روشنی میں کہ نخلہ کی مہم کا مقصد قریش یا کاروان قریش پر نظر رکھنا تھا مسلم مجاہدین کے کاروان قریش پر حملہ کرنے کی یہی فطری اور قابل قبول توجیہہ کی جا سکتی ہے۔

محققین نے اب تک اس نکتہ سے بحث نہیں کی ہے اور نہ ہی مآخذ سے اس کا بدیہی طور پر پتہ چلتا ہے کہ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش یا کاروان قریش پر نظر رکھنے کے لیے ایک مختصر سی جماعت کو مکہ کے اتنے قریب نخلہ کیوں بھیجا تھا؟ ظاہر ہے کہ آپ کو ان کے بارے میں کوئی خاص خبر یا پریشان کن اطلاع ملی تھی اس لیے آپ نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ وہ خبر یا اطلاع کیا تھی؟ قیاس یہ کہتا ہے کہ وہ خبر یہ تھی کہ قریش ایک بہت بڑا کارواں شام کو بھیجنا چاہتے ہیں جس کے بارے میں مآخذ کا بیان یہ ہے کہ اسمیں قریش کے ہر مرد و عورت نے جس کے پاس ایک مثقال یا اس سے زیادہ رقم تھی حصہ لیا تھا حتیٰ کہ بوڑھی عورت اور کمزور عورتوں نے سوت کات کر اس کارواں میں مال لگایا تھا جس کی مالیت پچاس ہزار کی خطیر رقم کے برابر تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر مسلمانان مدینہ کے لیے خاصی چونکا دینے والی تھی۔ اس میں حیران کن عنصر تجارتی مفادات نہ تھے بلکہ اس مخصوص کارواں کی نوعیت اور اس کے اسباب و عوامل تھے۔ آخر ایسی کونسی فوری معاشی اور اقتصادی

ضرورت پیش آگئی تھی جس کے لیے قریشیوں نے غیر معمولی کارواں ترتیب دیا تھا؟ کسی حد تک یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس کارواں کی غیر معمولی نوعیت ہی تھی جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تفتیش حال کے لیے ایک مختصر سا طلیعہ مکہ کے بالکل عقب میں بھیجنے پر مجبور کیا تھا۔ اسی سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بعض روایات میں قریش کے بجائے قریشی کارواں پر نظر رکھنے کی جو بات کہی گئی ہے غالباً کیا یقیناً اس سے بھی غیر معمولی اور عظیم کاروانِ قریش مراد تھا۔ کاروانِ نخلہ نہیں۔ موخر الذکر تو محض موقعہ و محل کی وجہ سے اور مسلم جماعت کی کارروائی کی وجہ سے اہمیت اختیار کر گیا اور اس طرح سے غلط فہمی اور صورت حال کے صحیح تجزیے میں ناکامی کا سبب بن گیا۔ بہرحال اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس عظیم و غیر معمولی کاروانِ قریش کی ترتیب و تنظیم اور اس کے محرکات و عوامل سے جن کی سن گن آپ کو کسی طرح سے مل گئی تھی تو آپ کو خدشہ تھا کہ یہ ساری تیاری غالباً مدینہ کی اسلامی ریاست اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی بڑے منصوبے کی خاطر کی جا رہی ہے۔ وہ منصوبہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ تجارتی دولت کو سیاسی و فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے اور مسلمانوں پر ایک کاری ضرب لگائی جائے[۱۸]۔

واضح رہے کہ یہ قریشی سیاسی و فوجی پالیسی کسی نئے معاشی سبب یا مسلمانوں کی جانب سے اپنی تجارت کو خطرہ میں دیکھ کر نہیں اپنائی گئی تھی جیسا کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں اور اپنے آخری مجموعی تجزیے میں تفصیل کے ساتھ دیکھیں گے بلکہ اس قدیم عداوت اسلام اور دشمنی رسول کے سبب تھی جو ان کو مکی عہد سے تھی۔ اس کے بعض سیاسی اسباب بھی تھے۔ قریش مکہ دیکھ رہے تھے کہ مدینہ کی اسلامی ریاست روز بروز وسیع تر اور طاقتور ہوتی جا رہی تھی۔ شہر کے اردگرد کے علاقے میں بسے ہوئے بدوی قبائل اس کے حلیف و دوست بنتے جا رہے تھے[۱۹] اور اس طرح مدینہ مکہ کے حریف کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اس کو اسی طرح ابھرنے اور پنپنے کا موقعہ دیا گیا تو وہ ایک دن اتنا طاقتور ہو جائے گا کہ ان کی سیاسی بالادستی کو ختم کر دے گا اس سیاسی بالادستی کا خاتمہ نہ صرف ان کی سیاسی موت کے مترادف ہوتا بلکہ ان کے مذہبی تخصص اور معاشی طاقت کے لیے بھی آخری کیل ثابت ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے مدینہ پر ایک کاری ضرب لگانے کے لیے اپنی تمام دولت ایک کارواں

میں جھونک دی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مکہ میں قریش کے متعدد معتدبہ افراد مدینہ سے مخاصمت اور جدال موں لینے کے حق میں نہ تھے اور وہ تاریخی و فطری عناصر کو ان کی قدرتی نشوونما کی بلا روک ٹوک اجازت دینے کے حق میں تھے لیکن تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ کا یہ معتدل اور نرم مزاج طبقہ آہستہ آہستہ ختم یا کمزور ہو رہا تھا اور اس کی جگہ سیاسی قیادت اور زمام کار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتی جا رہی تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دشمن ہی نہ تھے بلکہ وہ تلوار کے زور سے ان کو مٹا دینے کی پالیسی میں یقین رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت غزوۂ بدر کے موقع پر مکہ کے معتدل و صلح جو طبقہ پر اسکے جنگ جو اور جدال پسند طبقہ کی برتری سے ملتا ہے کیونکہ آخر کار یہ موخر الذکر طبقہ ہی تھا جو جنگ کرانے اور مستقبل میں اس کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔"(۳۱) اس طرح یہ بات تقریباً پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مہم نخلہ کا مقصد قریش کے آئندہ منصوبوں کی ٹوہ لینے کے لیے تھا اور اس کا محرک اس عظیم قریشی کارواں کی ترتیب و تنظیم تھی جو ابو سفیان بن حرب کی قیادت میں شام جانے والا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی غیر معمولی نوعیت اور زبردست تیاریوں کی خبریں سن کر تشویش ہونی لازمی تھی۔ کیونکہ آپ کے سامنے مدینہ کے دفاع اور امت مسلمہ کی جانی حفاظت کا زبردست سوال تھا اور ان دونوں مقاصد کو اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا تھا جبکہ دشمنوں کے ہر منصوبے سے باخبر رہا جائے۔ اسی لیے آپ نے نخلہ کی مہم ترتیب دی تھی۔ واقعات، شواہد اور دلائل کی روشنی میں یہ بلا ریب ثابت ہوتا ہے کہ اس مہم کا محرک و مقصد غارت گری مال کی حرص اور روز افزوں امت کی اقتصادی ضروریات کو پورا کرنا نہ تھا جیسا کہ مغربی مورخین نے دعویٰ کیا ہے بلکہ اس کا محرک و مقصد سیاسی اور دفاعی تھا۔ اس کی مزید تصدیق سریہ نخلہ میں شامل مجاہدین کی تعداد سے بھی ہوتی ہے۔ محض آٹھ یا بارہ آدمیوں پر مشتمل دستہ کوئی بڑا کارنامہ اور وہ بھی بالکل دشمن کے گھر میں نہیں لوٹ سکتا تھا اور نہ ہی لوٹ کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ پھر یہ کارروائی اصلاً چھ آدمیوں کے دستے نے کی تھی اتفاق سے کاروان نخلہ مختصر تھا لیکن اس کا بھی تو احتمال تھا کہ وہ مسلم دستے سے کافی بڑا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں چھاپہ مارنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے یہ خیال تقویت حاصل کرتا ہے کہ اگر چھاپہ مار

کارروائی مقصود ہوتی تو نسبتاً بڑا فوجی دستہ بھیجا جاتا۔ اور علاقائی یا جغرافیائی اسباب کی بنا پر یہ ضروری تھا کہ فوجی دستہ اتنا بڑا ضرور ہونا چاہئے تھا کہ وہ ہر قسم کی ممکنہ و غیر متوقع صورت حال سے پوری طرح نمٹنے کا اہل ہوتا۔ اس تمام طویل بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مآخذ کا یہ بیان صحیح ہے کہ مہم نخلہ کا مقصد دشمن کی جاسوسی تھی نہ کہ غارت گری اور لوٹ مار۔ ان کے علاوہ متعدد دوسری دلیلیں اور شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ نہ صرف یہ آخری ابتدائی مہم بلکہ ابتدائی مہمیں اقتصادی محرکات و مقاصد نہیں رکھتی تھیں۔

ہمارے مقبول و معروف مآخذ میں ابتدائی مہموں کی تعداد آٹھ بیان کی گئی ہیں جن میں چار سرایا اور اتنے ہی غزوات شامل کیے جاتے ہیں۔ ان کا ہم مفصل مطالعہ کر چکے ہیں لیکن ایک ابتدائی مگر کم معروف مورخ یا مصنف نے ان ابتدائی مہموں کی تعداد دس بتائی ہے اور چار کے بجائے چھ غزوات غزوۂ بدر سے پہلے ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ موجودہ مورخین اور ان کے طرز تاریخ نویسی کا انداز یہ ہے کہ مسلمہ مآخذ سے مختلف یا مستزاد روایات کو آسانی سے قبول نہیں کرتے اور اسکو ماننے میں غیر ضروری احتیاط برتتے ہیں تاہم ایک ابتدائی مورخ کی روایت کو بلا کسی منطقی سبب یا معقول شہادت کے نظر انداز کرنا محال ہے۔ بہرحال محمد بن حبیب بغدادی (متوفی ۲۴۵ھ) کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ بدر سے پہلے ماہ شعبان میں دو مہمیں دو مختلف علاقوں میں لے کر گئے تھے۔ اس کے بیان کے مطابق نویں ابتدائی مہم بروز جمعرات ۱۰ شعبان ۲ھ کو ینبع کے علاقے میں گئی تھی۔ وہاں کوئی مڈبھیڑ نہیں ہوئی اور آپ واپس آگئے۔ لیکن دسویں ابتدائی مہم کے بارے میں بڑا دلچسپ بیان ہے اور وہ یہ کہ ۱۴ شعبان ۲ھ بروز منگل آپ مدینہ منورہ سے روانہ ہوتے اور سفوان پہنچے۔ وہاں آپ نے قبیلۂ غفار سے باہمی امداد و اعانت کا ایک معاہدہ لکتاب موادعہ لکھا اور ایسا دوسرا معاہدہ بنو اسلم سے بھی کیا۔ اس غزوہ میں بھی کوئی جنگ نہیں ہوئی[۱۳۸]۔ بظاہر یہ بیان مسلمہ مآخذ کے خلاف ہے کیونکہ اوّل تو وہ ان غزوات کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتے۔ دوم یہ کہ بعض مآخذ کا اصرار ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمادی الآخرہ تا [illegible] رمضان مدینہ میں مقیم

رہے اور کہیں باہر تشریف نہیں لے گئے۔ (۱۷۵) لگوم یہ کہ غزوات و سرایا کی تعداد سے جو ان مآخذ میں صراحتاً بیان ہوئی ہے یہ بیان متصادم ہے۔ لیکن بہرحال کچھ ایسے داخلی و خارجی شواہد بھی ہیں جو بغدادی کے بیان کی سچائی ثابت کرتے ہیں۔ اور اوپر کی بیان شدہ دلیلوں کی تردید کرتے ہیں۔ مسلمہ مآخذ پر اضافہ یا اضافی معلومات کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ وہ غلط ہی ہیں۔ پھر آپ کے مدینہ میں جہاں تک مدت قیام کا تعلق ہے اس کی توثیق بعض دوسرے مآخذ سے نہیں ہوتی بلکہ کہیں کہیں تو تردید ہوتی ہے۔ (۱۷۷) اس کے علاوہ ستائیس غزوات اور اڑتیس سرایا کی تعداد بھی بعض مآخذ میں کم یا زیادہ پائی جاتی ہے۔ (۱۷۸) اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ دراصل مورخین اور اصحاب سیرت کو جتنی مہموں اور ان کی تفصیلات کا علم ہو سکا اور جہاں تک وہ معلومات ان کے طریق نگارش یا طبیعت کتابت لگا کھا سکیں انھوں نے ان کو بیان کیا۔ یہی سبب ہے کہ سیرت نبوی کے بارے میں عموماً اور مہموں کے بارے میں خصوصاً مختلف مآخذ میں معلومات کم و بیش ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ کم از کم دوسری مہم کے بارے میں واقعاتی شہادت یہ ہے کہ بنو غفار اور بنو اسلم سے جو معاہدے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے تھے ان کے متن دستیاب ہیں (۱۷۹) اور دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ ان معاہدوں کے پس منظر کے بارے میں کہ وہ کب اور کہاں ہوئے کچھ بھی مآخذ میں نہیں بیان ہوا ہے۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ بغدادی کا بیان صحیح ہے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ معاہدے انہیں مہموں کے دوران ہوئے ہوں۔ مزید برآں ان معاہدوں کی زبان و طرز بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ معاہدے عہد نبوی کے مدنی دور کے ابتدائی زمانے کے ہیں۔ بہرحال ان شواہد و دلائل کی روشنی میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بغدادی کا بیان صحیح ہے اور ابتدائی مہموں کی تعداد آٹھ نہیں بلکہ دس تھی۔ اگرچہ بغدادی نے اپنی اختصار پسندی اور تفصیلات سے گریز کی بری عادت (۱۸۰) کی وجہ سے ان مہموں کے پس منظر، حالات و اسباب وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے تاہم موجودہ تحقیقات اور معیار تحقیق کی بنا پر ان کے اسباب و علل اور عوامل کا پتہ لگانا اب کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں مہموں کے حالات و اسباب و عوامل وہی تھے جو دوسری

ابتدائی مہموں کے تھے یعنی عرب کے بدوی قبائل سے تعلقات محبت و دوستی اختیار کرنا اور اسلامی سیاست سے ان کو کسی نہ کسی طرح وابستہ کرنا۔ خوش قسمتی سے بنو غفار اور بنو اسلم سے غزوۂ سفوان کے ذیل میں معاہدۂ باہمی نصرو اعانت کا جو ذکر کیا ہے اس کی مکمل تصدیق ان معاہدوں کے متن سے ہوتی ہے جو دوسرے مآخذ میں مذکور ہیں۔ اور یہ ایک مزید دلیل ہے جو ابتدائی مہموں کے بارے میں وضاحت کرتی ہے کہ ان کے محرکات اقتصادی نہ تھے جیسا کہ ہمارے جدید مورخین کا اصرار ہے اس پر مزید بحث ہم اپنے آخری تجزیے میں کر رہے ہیں جواب شروع ہوتا ہے۔

آخری تجزیہ

ابتک ہم نے دس ابتدائی مہموں کے محرکات، مسائل اور مقاصد کا الگ الگ جائزہ لیا ہے اور اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ تمام کوششیں اور کاوشیں، کارروائیاں اور ہنگامے، مساعی اور سرگرمیاں دراصل ایک سوچی سمجھی اور منصوبہ بند سیاسی حکمت عملی کی مختلف کڑیاں تھیں۔ ان مہموں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانان مدینہ — مہاجرین اور انصار — کے سیاسی و سماجی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ ہجرت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ایک مذہبی اور سماجی نظام کا ڈھانچہ کھڑا کر رہے تھے جس کی ابتدا مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارے (مواخاۃ) سے ہوئی تھی اور پھر جب مسلمانوں کے ان دو علاقائی طبقوں کو دین کی بنیاد پر متحد کر لیا گیا تو مدینہ میں ایک اسلامی امت وجود میں آئی۔[۱۷] اس امت کی اساس اوّل اسلام تھا اور اس لحاظ سے وہ عرب کے قبائلی پس منظر میں بالکل نیا تجربہ تھا جس میں سماجی نظام یا معاشرت کا انحصار خون کے رشتوں کے بجائے مذہبی اخوت اور یگانگت پر تھا۔ امت مسلمہ کی تشکیل کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مدینہ کی یہودی قبائل اور اکا دکا عیسائی افراد کا مسئلہ تھا۔ پھر انصار کے دونوں عرب قبیلوں اوس و خزرج کے ان یہودی قبائل سے سیاسی، سماجی اور فوجی نوعیت کے تعلقات تھے جو کافی قدیم تھے۔ ان کے علاوہ مدینہ کے لوگوں کے قرب و جوار کے بدوی قبائل سے دوستی اور حلیفانہ تعلقات تھے۔ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان تعلقات کو نہ تو نظر انداز کر سکتے تھے اور نہ ان کو

بھی کام میں نہیں دے سکتے تھے۔ امت مسلمہ دنیا سے کٹ کر اور اپنی ارد گرد کی بستیوں اور قبیلوں سے منقطع ہو کر ایک سماجی خلا میں زندہ نہیں رہ سکتی تھی اور نہ ہی پرانے تعلقات نئے حالات میں اور نئے لوگوں کے لیے مفید ہو سکتے تھے۔ ان سماجی تقاضوں اور ضروریات نے امت مسلمہ کے سربراہ کے لیے ایک عملی اور مفید لائحہ عمل تیار کرنا ناگزیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے پہلے ایک سیاسی و سماجی نظام قائم کیا جس کو عام طور سے سماجی تحفظ کا نظام (Social Security System) کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق امت مسلمہ کے سماجی تعلقات مدینہ کے یہودی قبیلوں سے قائم کیے گئے اور ایک معاہدہ کے ذریعہ جس کو عموماً دستور مدینہ کہا جاتا ہے اور جس کو ابن اسحاق نے "کتاب رسول" یا "صحیفہ رسول" کا نام دیا ہے۔ مدینہ کی پوری آبادی کو سماجی و سیاسی تحفظات و ضمانتوں کی خاطر ایک سیاسی نظام کے تحت مجتمع کر دیا گیا۔ مذہبی اختلافات کے باوجود مسلمان اور یہود اور ان کے حلیف ایک دوسرے کے حلیف و دوست قرار پائے اور ان کے بعض فرائض و ذمہ داریوں کے ساتھ ان کے حقوق واضح کر دیے گئے۔[۱۳] اس طرح مدینہ میں ایک نیا سیاسی نظام از خود وجود میں آ گیا۔ اس سیاسی و سماجی نظام کا دائرۂ کار مدینہ تک محدود نہ رہ سکا کیونکہ مسلمانوں کو اپنے پڑوسیوں سے سماجی تعلقات فطرتاً رکھنے تھے اور سیاسی تعلقات بھی بعض اسباب کی بنا پر قائم کرنا ناگزیر تھا۔ قرب و جوار خاص کر مغربی علاقے کے بدوی قبائل سے انصار کے قدیم حلیفانہ و دوستانہ تعلقات نے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی اور وہ اپنے پرانے تعلقات کی بنا پر مہاجرین و امیر مہاجرین کے بھی دوست بن گئے۔ لیکن اب نوعیت دوسری ہو چکی تھی۔ مدینہ میں عملاً مہاجرین و انصار کے دو ممتاز طبقات کی تفریق مٹ چکی تھی اور ایک امت مسلمہ قائم ہو چکی تھی۔ اس امت کا ایک سیاسی نظام قائم ہو چکا تھا۔ جس میں ایک باقاعدہ حکومت کا تصور ابھرنے لگا تھا۔ پڑوس کے قبائل کے تعلقات اب انفرادی قبائل اور چھوٹی بڑی سماجی اکائیوں سے نہیں بلکہ ایک بڑے سماجی و سیاسی نظام اور ایک باقاعدہ منظم حکومت سے استوار ہونے تھے۔ مدینہ کی شہری ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی قبائل سے دوستانہ و حلیفانہ تعلقات

قائم کیے۔ لیکن کب اور کیسے ؟ اس پر ہمارے مآخذ کا واضح جواب نہیں ملتا۔ البتہ ابتدائی مستند مآخذ اور جدید مؤرخین دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ تعلقات ہجرت کے فوراً بعد قائم ہو گئے تھے اور سلسلۂ کے ذریعہ وجود میں آئے تھے۔ ابتدائی مہمیں جو کہ بدقسمتی اور غلط فہمی سے فوجی مہمیں سمجھ لیا گیا ہے دراصل سیاسی سفارتیں یا مشن تھے۔ اور انہیں مہموں کے دوران قرب وجوار کے علاقوں سے تعلقات قائم ہوئے تھے۔

علاقائی یا جغرافیائی سیاست کا ایک اہم عنصر مکہ کا قریشی اشرافیہ تھا۔ پورے عرب میں اس کو مذہبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی بالادستی حاصل تھی۔[143] اگرچہ بعض اوقات اس کے بعض حریفوں سے نبردآزما ہونے کے واقعات ملتے ہیں۔[144] تاہم تمام عرب قبائل قریش کی ہمہ جہت بالادستی کے معترف تھے۔ اسلام کی آمد نے اور پھر اس کی بتدریج ترقی و توسیع نے اس بالادستی کو چیلنج دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اور اسی بنا پر مکی اشرافیہ نے اسکی بھرپور مخالفت کی تھی۔ لیکن یہ مخالفت کامیاب نہیں ہو سکی اور بالآخر مسلمانوں کو ایک جائے پناہ یثرب میں مل گئی اور مکی مسلمانوں نے وہاں پہنچ کر اپنے دینی مدنی بھائیوں کے ساتھ ایک سیاسی و سماجی نظام قائم کر لیا۔ ظاہر ہے کہ مکی اشرافیہ کو یہ نظام کسی طور پر پسند نہیں آ سکتا تھا اور وہ اس کے لیے نفرت و عناد کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں رکھتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی بصیرت نے بخوبی محسوس کر لیا تھا کہ قریش مکہ کی اسلام و رسول دشمنی ایک دن رنگ لا کر رہے گی۔[145] اس لیے عرب دستور قبائل کے مطابق آپ نے ایک سیاسی اتحاد کا منصوبہ بنایا جس کے تحت اس علاقے کے تمام عناصر کو اسکا رکن بنا دیا جائے تاکہ بوقت ضرورت قریش کی سیاسی و فوجی طاقت کا کامیاب مقابلہ کیا جا سکے چنانچہ آپ کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ قریب کے بدوی قبائل سے حلف و دوستی کے تعلقات از سر نو اور نئی بنیادوں پر قائم کیے جائیں۔ اور یہی کام ان ابتدائی مہموں کے دوران کیا گیا تھا۔

خوش قسمتی سے مآخذ میں ان ابتدائی مہموں کے سلسلے میں بعض ایسے اشارے، حوالے اور کہیں کہیں واضح تصریحات ایسی موجود ہیں جو ان مہموں کے اس مقصد و محرک کی طرف صاف نشاندہی کرتی ہیں۔ پہلی مہم کے ذیل میں مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مغربی قبیلہ۔ جہینہ ۔ کے

علاقے میں گئی تھی۔ ان لوگوں سے مسلمانوں کے دوستانہ تعلقات تھے جیسا کہ جہنی سردار مجدی بن عمرو
کے بارے میں ماخذ نے صراحت سے کہا ہے اور جس طرح کہ قریشی کاروان اور مسلم جماعت کے درمیان
اس کے مصالحانہ رویے سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسری مہم جس علاقے میں گئی تھی وہ بنو خزاعہ
اور بنو ضمرہ کا تھا۔ ان دونوں بدوی قبیلوں سے مسلمانوں کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ اور
ان سے معاہدوں کا کیا جانا یا اس کے سلسلے میں گفت و شنید کرنا اسی زمانے میں ہوتا نظر آتا ہے۔
تیسری مہم سریہ خرار بھی بنو ضمرہ کے علاقے میں گئی تھی اور یعقوبی نے تصریح کی ہے کہ مسلمانوں کا
ان لوگوں سے بھی دوستی کا معاہدہ تھا۔ چوتھی مہم میں ماخذ کا واضح بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے بنفس نفیس بنو ضمرہ سے ایک معاہدہ ان کے سردار مخشی بن عمرو ضمری کے ذریعہ کیا تھا۔
اس سلسلے میں کیا یہ محض اتفاق تھا یا ایک منصوبہ بند پالیسی کہ مؤخر الذکر تین مہمیں یکے بعد دیگرے
بنو ضمرہ کے علاقے میں پہنچی تھیں؟ پہلی دو مہموں کے سیاق میں ماخذ نے مبہم انداز سے صرف
دوستی اور معاہدہ کا ذکر کیا ہے جبکہ تیسری مہم میں ایک معاہدۂ صلح طے پا جانے کی بات بصراحت کہی
گئی ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ بنو ضمرہ کے علاقے میں جانے والی پہلی دو مہموں میں زمین ہموار
کی گئی تھی اور تیسری مہم میں ان سے باقاعدہ معاہدۂ عمل میں آیا۔ پانچویں ابتدائی مہم علاقہ
بنو جہینہ میں گئی تھی۔ غالباً پہلی ابتدائی مہم اور اس مہم کا مقصود ایک تھا یعنی قبیلہ جہینہ سے
تعلقات دوستی استوار کرنا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ قبیلہ جہینہ اور مزینہ اسلامی امت کے
اولین ارکان میں تھے لیکن ان سے مسلمانان مدینہ کے تعلقات قائم ہونے کی طرف کوئی اشارہ
نہیں ملتا۔ لیکن یہ حقیقت تھی اور مسلم حقیقت تھی۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قبیلے سے انہیں
مہموں کے دوران دوستی کے تعلقات قائم ہوئے ہوں گے۔ اسی طرح اس نوع کی چھٹی مہم میں
ماخذ کا واضح بیان ہے کہ آپ نے ذو العشیرہ کے بنو مدلج اور ان کے پڑوسی بنو ضمرہ جو ان کے
۱ حلیف بھی تھے، سے معاہدۂ صلح کیا تھا۔ جہاں تک ساتویں اور آٹھویں مہموں کا تعلق ہے ان کی
نوعیت قطعی جداگانہ تھی۔ ایک تادیبی کارروائی تھی اور ایک غارت گر کے تعاقب میں بھیجی گئی تھی